AL-AHQAQ **Recognized by HEC in Y-Category**
https://ahqaq.com/index.php/Journal/issue/view/9 ONLINE - ISSN- 3006-595X
Volume.4, Issue.1 (2026) PRINT - ISSN- 3006-5941

تبصرہ کتاب "دنیا کے بڑے مذاہب از "عماد الحسن آزاد فاروقی"

Book Review"Dunyā ke Baray Mazāhib" by" Imad al-Hasan Azad Farooqi"

Kubra Begum

Ph.D. Scholar, Institute of Islamic Studies and Sharia, M.Y. University, Islamabad

Email. kubrazeshan544@gmail.com

Dr. Bushra Subhan

Associate Professor, Institute of Islamic Studies and Sharia, M.Y. University, Islamabad

Email. bushra.furqan@myu.edu.pk

Abstract

This article presents a structured review of a book titled "Dunya ke Baray Mazahib" (The Major Religions of the World), which offers a comprehensive introduction to eight major religions: Hinduism, Buddhism, Jainism, Zoroastrianism, Sikhism, Judaism, Christianity, and Islam. The study highlights the author's stated objective of addressing the lack of balanced, research-based, and objective works on comparative religion in the Urdu language. Emphasis is placed on the book's methodological approach, which seeks to present each religion sympathetically yet analytically, relying on historical development, doctrinal foundations, and primary textual references. The article examines how each chapter outlines the historical background, core beliefs, sacred texts, internal developments, and sectarian formations within the respective traditions. It also notes the inclusion of appendices containing selected excerpts from sacred scriptures, enabling readers to engage directly with foundational sources. Through a descriptive and analytical overview, this paper evaluates the book's contribution to the academic study of religions and its relevance for students of comparative religion. The findings suggest that the work serves as a useful introductory resource that promotes informed understanding and intellectual engagement across religious traditions.

Key words: comparative studies, major world religions, religious history, religious traditions, inter faith understanding.

مطالعہ مذاہب اور تقابلِ ادیان عصرِ حاضر میں سماجی علوم میں ایک مستقل موضوع بن چکا ہے۔ یہ ایک نہایت اہم اور وسیع تحقیقی میدان ہے جس میں دنیا کے بڑے اور معروف مذاہب کے عقائد، عبادات، اخلاقی تصورات، تاریخی ارتقاء اور فکری ساخت کا باہمی موازنہ کیا جاتا ہے۔ یہ علم نہ صرف مذہبی تنوع کو سمجھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے بلکہ عالمی سطح پر بین المذاہب مکالمے، سماجی ہم آہنگی اور فکری توازن پیدا کرنے میں بھی موثر ثابت ہوتا ہے۔ تقابلِ ادیان کی ایک معیاری کتاب کا مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مختلف مذہبی نظاموں کو ان کے اصل منابع، مذہبی متون، تاریخی حقائق اور فکری پس منظر کی روشنی میں پیش کیا جائے اور قارئین کو ایسی معلومات فراہم کی جائیں جو نہ تعصب پر مبنی ہوں نہ جذباتیت پر، بلکہ تحقیقی اصولوں اور علمی امانت داری پر قائم ہوں۔

تقابلِ ادیان کے موضوع پر لکھی گئی کسی بھی کتاب کا مطالعہ اس وقت زیادہ مفید اور مؤثر ہوتا ہے جب وہ مختلف مذاہب کے نظریات کو ان کے اپنے سیاق و سباق میں بیان کرے، ان کے بنیادی عقائد اور اہم شخصیات کا غیر جانب دار انداز میں ذکر کرے، اور پھر ایک معتدل، مدلل اور علمی معیار کے ساتھ ان کی مماثلت اور اختلافات کو واضح کرے۔ ایسی کتابیں طلبہ، محققین اور عام قارئین کے لیے یکساں طور پر اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ وہ ان میں نہ صرف مذہبی تاریخ اور عالمی فکری ورثے سے واقفیت حاصل کرتے ہیں بلکہ دنیا میں موجود مختلف تہذیبوں کے فکری سرچشموں کو بھی بہتر طور پر سمجھ پاتے ہیں۔ اسی تناظر میں جب ہم تقابلِ ادیان کی کسی کتاب پر تبصرہ لکھتے ہیں تو اس کی علمی قدر، اسلوبِ تحقیق، بنیادی مصادر سے استفادہ، غیر جانبداری، تجزیاتی گہرائی، تاریخی درستگی اور پیش کردہ دلائل کے معیار کو سامنے رکھتے ہیں۔ یہی عناصر کسی بھی کتاب کے علمی و تحقیقی مقام کا تعین کرتے ہیں اور اسے معاصر علمی ذخیرے میں ایک معتبر اضافہ ثابت کرتے ہیں۔

تعارف کتاب و مصنف

"دنیا کے بڑے مذاہب" عماد الحسن آزاد فاروقی کی وہ اہم تصنیف ہے جس میں مصنف نے عالمی مذاہب کو علمی، غیر جانب دار اور جامع انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے نہایت محنت، دقتِ نظر اور تحقیقی بصیرت کے ساتھ دنیا کے آٹھ بڑے مذاہب ہندومت، بدھ مت، جین مت، زرتشتیت، سکھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا جامع تعارف پیش کیا ہے۔ کتاب میں ان مذاہب کی تاریخ، بنیادی عقائد، نظریات، مذہبی تعلیمات، معاشرتی اثرات اور ان کے امتیازی پہلوؤں کو نہایت خوبصورتی سے یکجا کیا ہے۔ فاضل مصنف کی تحریر سلاست، جامعیت اور غیر جانب داری کا حسین امتزاج ہے جو قاری کو نہ صرف معلومات فراہم کرتی ہے بلکہ تقابلِ ادیان کی گہری بصیرت بھی عطا کرتی ہے۔

کتاب کا بنیادی مقصد قاری کو ہندومت، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت، اسلام، سکھ مت اور دیگر عالمی مذاہب کے عقائد، تاریخی پس منظر، بنیادی متون اور فکری خصوصیات سے واقف کرانا ہے۔ مصنف نے مذہبی تنوع کو احترام کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ہر مذہب کو اس کے اپنے مصادر و مراجع کی روشنی میں متعارف کرایا ہے، جس سے نہ صرف تقابلِ ادیان کے طلبہ بلکہ عام قارئین کو بھی عالمی مذہبی نقشے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کتاب کی یہی جامعیت، سادہ اسلوب اور تحقیقی اعتدال اسے اس موضوع پر لکھی گئی اہم کتب میں شمار کرتی ہے۔

المختصر "دنیا کے بڑے مذاہب" محض معلومات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسا مربوط تعارف ہے جو مذہبی تاریخ اور تقابلِ ادیان کے بنیادی اصولوں کو بامقصد شکل میں پیش کرتا ہے۔ مصنف نے عالمی مذاہب کے فکری دھاروں کو ایک ہی علمی فریم میں جمع کر کے ایک ایسا مطالعہ فراہم

کیا ہے جو عام قارئین اور طلبہ دونوں کے لیے یکساں مفید، قابلِ اعتماد اور رہنمائی پر مبنی ہے۔

تعارف مصنف

عماد الحسن آزاد فاروقی عصرِ حاضر کے سنجیدہ محقق، صاحبِ مطالعہ مصنف اور تقابلِ ادیان کے موضوع پر قلم اٹھانے والے ممتاز اہلِ علم میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ باکمال محقق ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد کتب کے مصنف تھے۔ آپ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سابق صدر اور مرکز برائے تقابل ادیان جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے سابق ڈائریکٹر تھے۔ آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "پروفیسر اقتدار محمد خان "شعبہ اسلامک سٹڈیز اور ڈین فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز جامعہ ملیہ اسلامی نے شعبہ اسلامک سٹڈیز میں منعقد ایک تعزیتی نشست میں کہا[1]۔

> "آپ نے مذاہب عالم کے حوالے سے نہایت قابلِ قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ دینیات، تاریخِ ادیان اور عالمی مذاہب پر ان کی گہری نظر اور وسیع مطالعہ ان کی تحریروں کو غیر معمولی جامعیت اور تحقیقی وقار عطا کرتا ہے۔ زبان و بیان کی سلاست، حوالہ جاتی صحت اور غیر جانب دارانہ اسلوب ان کی علمی شخصیت کا نمایاں وصف ہے۔"[2]

مصنف نے بہت سی تحقیقی کتب تحریر کیں، آپ نے اپنی تصنیفات میں مختلف مذاہب کے بنیادی عقائد، تاریخی پس منظر، نظریاتی ارتقاء اور معاشرتی اثرات کو نہایت متوازن اور محققانہ طرزِ فکر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "دنیا کے بڑے مذاہب "ان کی انہی علمی کاوشوں کا شاہکار ہے، جس میں انہوں نے تقابلِ ادیان کے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے آٹھ بڑے عالمی مذاہب کا جامع، منظم اور بے لاگ تجزیہ پیش کیا ہے۔ علمی سنجیدگی، دیانتِ فکر اور موضوع سے گہری وابستگی کے باعث یہ کتاب اور اس کا مصنف دونوں دینی و علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

آپ کی تصانیف

- دنیا کے بڑے مذاہب
- عشق اور بھگتی (1978)
- اسلامی تہذیب و تمدن (ابتدائے اسلام سے زوالِ بغداد تک)
- اسلامی تہذیب و تمدن (مغربی ایشیائی ورثہ)
- ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء[3]

آپ کی وفات پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر اقتدار احمد خان صاحب نے فرمایا:

> "ان کا انتقال واقعتاً علمی دنیا کا ایک عظیم خسارہ ہے اور اس کی کسک مدتوں علمی دنیا کو محسوس ہوتی رہے گی۔"[4]

پروفیسر سید شاہد علی سابق صدر شعبہ نے فرمایا:

> پروفیسر فاروقی بہت ہی مخلص استاد اور قائد تھے۔ ان کی زندگی میں تقویٰ کا پہلو نمایاں تھا اور وہ متعدد اہم خصوصیات جیسے ایمانداری، اصول پسندی، قانون پسندی وغیرہ کے حامل تھے۔"[5]

جنید حارث سینیئر استاد نے فرمایا:

"آپ نے مذاہب عالم کے حوالے سے بڑا تحقیقی کام کیا ہے اور آپ کی اس خدمت سے علمی دنیا ہمیشہ مستفید ہوتی رہے گی۔"

ڈاکٹر عمر فاروق نے فرمایا:

"استاد محترم طلبہ کو برابر نہ صرف مطالعہ کی تاکید کرتے تھے بلکہ وہ اس سلسلے میں بلا تفریق مذہب و مسلک تمام مصنفین کی کتابوں سے مستفید ہونے کی تلقین کرتے تھے۔"[6]

ان تمام آراء سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پروفیسر صاحب کی شخصیت قائدانہ صلاحیتوں کا مرجع و مرقع اور غیر جانبدار تھی۔

تبصرہ کتاب

یہ کتاب "دُنیا کے بڑے مذاہب" پیش گفتار اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، جن میں بالترتیب ہندو مت، بدھ مت، جین مت، زرتشت، سکھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا تعارف اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے اختتام پر مصنف نے ہر مذہب کی مقدس کتابوں سے منتخب اقتباسات پر مشتمل ضمیمہ جات شامل کیے ہیں، جن کے ذریعے متعلقہ مذاہب کے بنیادی عقائد کو براہِ راست مصادر کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں باقاعدہ مقدمہ شامل نہیں، تاہم پیش گفتار خود مصنف کا تحریر کردہ ہے، جس میں انہوں نے تصنیف کا مقصد نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک اردو زبان میں مطالعۂ مذہب کے موضوع پر ایسی معیاری کتب کی نمایاں کمی پائی جاتی ہے جو جدید تحقیقی اصولوں کے مطابق، ہمدردانہ، غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز میں لکھی گئی ہوں اور دیگر مذاہب کے بارے میں مستند معلومات فراہم کرتی ہوں۔ مصنف کے خیال میں یہ کتاب اسی علمی خلا کو پُر کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ مزید برآں، پیش گفتار میں مطالعۂ مذہب کے مختلف رجحانات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تقابلِ ادیان کے طالبِ علم کو اس میدان کی مثبت اور تعمیری جہات سے متعارف کرایا گیا ہے، جس سے علمی وسعت اور فکری اعتدال پیدا ہوتا ہے۔

وہ مذہب کو انسان کی بنیادی ضرورت بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"آثارِ قدیمہ، علم الانسان اور جغرافیائی تحقیقات نے واضح کر دیا ہے کہ اب تک انسان کی کوئی مستقل جماعتی، قومی، یا تہذیبی زندگی ایسی نہیں رہی جو مذہب کی کسی نہ کسی شکل سے عاری رہی ہو۔ یہ چیز اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مذہب کا تعلق ضرور بالضرور انسان کی کسی بہت بنیادی ضرورت سے ہے، جس کے بغیر اگر اس کی دنیاوی زندگی خطرے میں نہ پڑے تو کم از کم سنگین بحران کا شکار ہو جائے گی۔"[7]

اس اقتباس میں مصنف نے مذہب کی آفاقی حیثیت اور انسانی زندگی میں اس کی بنیادی ضرورت پر نہایت مضبوط اور سائنسی بنیادوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کا مؤقف ہے کہ اگرچہ مذہب کے بغیر انسان کی دنیاوی اور معاشرتی زندگی مکمل طور پر تباہ نہیں ہو جاتی، لیکن اس کے نتیجے میں فکری انتشار، اخلاقی بحران اور روحانی بے سمتی ضرور پیدا ہوتی ہے، جو کسی بھی تہذیب کے لیے سنگین نتائج کا باعث بن سکتی ہے۔ یوں یہ اقتباس مذہب کو ایک تاریخی حقیقت کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کی بنیادی اور لازمی ضرورت کے طور پر پیش کرتا ہے، اور واضح کرتا ہے کہ مذہب کے بغیر انسان کی اجتماعی زندگی نہ تو مستحکم رہ سکتی ہے اور نہ ہی بامقصد۔

مقدمے کے اختتام پر وہ تقابل ادیان کے طالب علم میں مثبت صلاحیت پیدا کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں وہ تحریر کرتے ہیں:

"ایک سنجیدہ طالب علم یا محقق کو مذہبی روایت کا مطالعہ محض بیرونی مشاہدے یا تعصب پر مبنی تنقید کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اسے دوسرے مذہب کے تناظر، احساسات اور داخلی زاویے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"[8]

مصنف کا یہ نکتہ اپنی جگہ بہت مضبوط اور آفاقی ہے کہ جب تک ایک طالب علم اپنے ذاتی عقائد، فکری تحفظات اور مذہبی تعصبات کو کچھ دیر کے لیے پس پشت نہ ڈال دے، وہ دوسرے مذہب کی اصل روح، اس کے اندرونی محرکات اور اس کے ماننے والوں کی فکری دنیا کو حقیقی معنوں میں نہیں سمجھ سکتا۔ اس طریقے کو اختیار کرنے سے محقق کے اندر غیر جانب داری، علمی توازن بین المسالک و بین المذاہب فہم، وسیع النظری جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں، جو تحقیقی مطالعے کی بنیاد ہیں۔

وہ ایک ممکنہ اعتراض کا بروقت جواب دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"ایک مذہبی روایت سے تعلق رکھنے والا شخص کیسے کسی دوسری مذہبی روایت کو اندرونی زاویے سے دیکھ سکتا ہے؟ وہ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ یہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ ایک سنجیدہ محقق کا یہی شیوہ ہونا چاہیے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد کو ترک نہیں لیکن عارضی طور پر معطل کر دے، یعنی انہیں تحقیق میں تعصب کی صورت میں مداخلت نہ کرنے دے۔ جب محقق خود کو دوسرے کی جگہ رکھ کر محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے تو وہ دوسرے مذہب کی حقیقت کو کہیں زیادہ صحیح، عمیق اور متوازن انداز سے سمجھنے لگتا ہے۔"[9]

یہ نقطہ نظر تقابل ادیان کے اعلیٰ سطحی اصولوں کے عین مطابق ہے۔ ان کا زور اس بات پر ہے کہ مذہبی تحقیق محض معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نام نہیں بلکہ فہم، تجربہ اور غیر جانب دارانہ مشاہدہ کا نام ہے۔ لہٰذا یہ تحریر طالب علموں کے لیے نہایت اہم رہنمائی فراہم کرتی ہے کہ اگر وہ واقعی دوسرے کو سمجھنا چاہتے ہیں تو انہیں پہلے اپنے اندر وہ صلاحیت بیدار کرنا ہوگی جس سے وہ اپنی فکری دیواروں کے پیچھے رہنے کے بجائے دوسرے مذہب کے زاویہ نگاہ کو اندر سے دیکھ سکیں۔

کتاب کے پہلے باب میں ہندومت کا تفصیلی، منظم تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں ہندو مذہبی روایت کے تاریخی و فکری ارتقاء کو بنیاد بنا کر برہمنی روایت کی تشکیل اور اس کے تدریجی فروغ کو واضح کیا گیا ہے۔ وہ اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

"اس مذہب کی اصل بنیاد ویدی روایت ہے، جو آریاؤں کے مذہبی عقائد، دعاؤں اور عبادتی نظموں پر مشتمل تھی۔ ہندومت کسی ایک پیغمبر، ایک کتاب یا ایک مخصوص دور میں نہیں شروع ہوا؛ بلکہ یہ عقائد، نظریات اور روحانی تصورات کا وہ مجموعہ ہے جو مسلسل ارتقاء کے نتیجے میں تشکیل پایا۔ اس مذہب کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں کیونکہ وادی سندھ منہجو دڑا اور ہڑپا کی کھدائی میں جو آثار ملے ہیں اس کی زبان اب تک پڑھی نہ جا سکی۔"[10]

اس کی تائید دیگر مصنفین کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے:

اے ایل باشم لکھتے ہیں:

"Hinduism had no single founder, no single scripture, and no single starting point. It grew from the religious life of the Indo-Aryans

preserved in the Vedas and later developed through many centuries."[11]

اے ایل باشم ہی آگے لکھتے ہیں:

"Our knowledge of the Indus Valley religion is very limited, since its script has not yet been deciphered."[12]

مصنف نے ہندو مذہب کی بنیادی مذہبی و ثقافتی روایات کو سمجھانے کے لیے رامائن اور مہابھارت جیسے اہم مذہبی و ادبی متون کا تعارف بھی شامل کیا ہے، جنہوں نے ہندو فکر اور تہذیب کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ ہندو مت کی مقدس کتابوں کو شرتی یعنی الہامی قرار دیتے ہیں۔ وہ ان کتب کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

"وید میں بیان کردہ حقائق ازلی اور ابدی سچائیاں ہیں جو اپنا ایک مستقل اور لازوال وجود رکھتی ہیں۔ قدیم رشیوں نے اپنی بلند روحانی صلاحیت کی بنا پر ان سچائیوں کو گویا سن لیا اور پھر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ اسی بنا پر پورے ویدک ادب کو شُرتی کہا جاتا ہے، یعنی وہ علم جو سنا گیا ہو، اور اسے نہ خدا کی براہِ راست تصنیف سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی انسان کی ایجاد، بلکہ ازلی حقیقت کا اظہار تصور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مجموعی طور پر ویدک ادب کو مذہبی حیثیت سے مقدس اور شرتی کے دائرے میں شمار کیا جاتا ہے۔"[13]

"The Vedas are not regarded as the compositions of human authors, but as eternal truths heard by ancient seers (ṛṣis)."[14]

رامائن اور مہابھارت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ کتب سمرتی ہیں:

"اپنشد کے بعد کی تصانیف، جیسے رامائن اور مہابھارت وغیرہ، اگرچہ برہمنی مذہب کی مقدس کتابوں میں شامل ہیں، مگر انہیں شرتی کا درجہ حاصل نہیں۔ یہ کتب سمرتی کہلاتی ہیں، یعنی وہ روایات جو یادداشت کے ذریعے منتقل ہوئیں اور جنہیں انسانوں کی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔"[15]

باب میں وقت کے ساتھ ساتھ نئے دیوی دیوتاؤں کے ظہور اور مذہبی عقائد میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیا گیا ہے، نیز ہندو مت میں پائے جانے والے مواحدانہ رجحان کی نشان دہی کی گئی ہے، جو کثرتِ دیوتا کے باوجود وحدتِ حقیقت کے تصور کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد فرقہ بندی کے دور پر گفتگو کی گئی ہے، جس کے نتیجے میں ہندو مت کے مختلف مسالک وجود میں آئے، جیسے شیو مت، ویشنو مت اور دیوی مت۔

مزید برآں، اس باب میں ہندو مذہب کے قانونی اور سماجی نظام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح مذہبی عقائد نے معاشرتی زندگی، رسوم و رواج اور اخلاقی اقدار کو متاثر کیا۔ مجموعی طور پر یہ باب ہندو مت کے مذہبی، فکری اور سماجی پہلوؤں کا جامع اور سادہ تعارف فراہم کرتا ہے، جو قاری کو اس مذہب کی ساخت اور ارتقاء کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

مصنف مزید بیان کرتے ہیں کہ مختلف بنیادوں پر اس کی الگ الگ تقسیمات کی گئی ہیں، جن میں دو تقسیمیں زیادہ مشہور ہیں۔

"پہلی تقسیم علمی اور تحقیقی اعتبار سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے، جو ویدک ادب کے زمانۂ تصنیف اور موضوعات کی بنیاد پر کی

گئی ہے۔ اس تقسیم کے مطابق ویدک ادب کا قدیم ترین حصہ سمہتا کہلاتا ہے، جس میں قدیم آریہ دیوی دیوتاؤں کی مدح میں کہے گئے بھجن اور ان سے وابستہ عقائد شامل ہیں۔ اس کے بعد جو ادب مرتب ہوا وہ برہمن کے نام سے معروف ہے۔[16]" دوسری تقسیم کے مطابق پورے ویدک ادب کو چار ویدوں میں تقسیم کیا گیا ہے: رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھر وید۔ ان چاروں ویدوں میں سے ہر ایک کے چار حصے ہیں: پہلا سمہتا، دوسرا برہمن، تیسرا ارنیکا اور چوتھا اپنشد۔[17] اس طرح ویدک ادب نہ صرف مذہبی اعتبار سے بلکہ فکری اور تاریخی پہلوؤں سے بھی ایک منظم اور ارتقائی نظام کی صورت میں سامنے آتا ہے۔"[18]

ہندوؤں کے ذات پات کے نظام اور سماجی طبقاتی تقسیم کے حوالے سے وہ رگ وید کے بھجن کا ترجمہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

- "اس کے منہ سے برہمن جاتی پیدا ہوئی، ہاتھوں سے چھتری
- راجا، اس کی ٹانگوں سے
- عام آدمی (ویش) پیدا ہوا جو کاروبار میں مشغول رہتا ہے کم حیثیت
- غلام نے اس کے پیروں سے جنم لیا۔"[19]

اسی طرح بھجن یا ویدک ادب میں موجود دوسرے حوالوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں آریاؤں کی آباد کاری کے ابتدائی دور سے آریہ سماج پرورن کی بنا پر سماج کی طبقاتی تقسیم موجود تھی۔ وہ اس بات کے ثبوت میں ایک اور کتاب کا حوالہ دیتے ہیں:

"لیکن اس سلسلے میں کثیر شواہد موجود ہیں کہ ویدک دور میں اور اس کے بعد ہندو فقہا کی نظر میں ورن کی طبقاتی تقسیم نہ تو اس قدر بے لچک تھی اور نہ ہی طبقات کے درمیان ایسی اٹوٹ دیواریں حائل تھی جیسا قرون وسطیٰ کے ہندو معاشرے میں ذات پات کے نظام میں ملتی ہیں۔"[20]

عماد الحسن فاروقی اس کتاب میں واضح کرتے ہیں کہ ہندو مت کی بنیاد برہمن کے تصور پر قائم ہے، جسے ہندو فلسفہ کائنات کی مطلق اور ابدی حقیقت قرار دیتا ہے، جیسا کہ وہ رقمطراز ہیں:

"ہندو مت کی اصل بنیاد برہمن کے عقیدہ پر قائم ہے۔ برہمن کو ہندو سب سے بڑا، ابدی اور پوشیدہ خدا سمجھتے ہیں، جو نظر تو نہیں آتا لیکن پوری کائنات اسی سے بنی ہے اور اسی پر قائم ہے۔ ہندو فلسفے میں یہ خیال بہت اہم ہے کہ انسان کی روح کو آتما کہا جاتا ہے اور اصل حقیقت یہ ہے کہ آتما اور برہمن دراصل ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، لیکن انسان یہ حقیقت سمجھ نہیں پاتا۔ یہ بات سب سے زیادہ واضح طور پر اپنشد نامی کتابوں میں ملتی ہے، جو ہندو مت کی فکری کتابیں ہیں اور ویدوں کے اہم حصے سمجھی جاتی ہیں۔ اپنشد انسان کو یہ سکھاتی ہیں کہ جب آدمی اپنی روح کی حقیقت پہچان لیتا ہے تو وہ برہمن کو پہچان لیتا ہے، اور اسی پہچان کو ہندو مت میں موکشا یعنی نجات کہا جاتا ہے۔"[21]

کتاب کے دوسرے باب میں بدھ مت کا جامع اور منظم تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کا آغاز گوتم بدھ کی زندگی اور ان کی بنیادی تعلیمات سے ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد چھٹی صدی قبل مسیح میں شمالی ہندوستان میں پڑی۔ دنیا کے مختلف خطوں، خصوصاً ایشیا میں، بدھ مت نے

فکری، اخلاقی اور تہذیبی سطح پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، جیسا کہ عماد الحسن فاروقی رقمطراز ہیں:

"ہندوستان میں چھٹی صدی قبل مسیح قومی سطح اور عالمی پیمانے کے دو بڑے مذاہب، جین مت اور بدھ مت کی ابتدا کا زمانہ ہے۔ بدھ مت جو اس وقت بھی ایشیا کے متعدد ممالک میں اکثریت کا مذہب ہے، تاریخ کے ایک طویل دور میں اپنے ماننے والوں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا مذہب رہ چکا ہے، جس کے دائرہ اثر میں مغربی ایشیا کو چھوڑ کر ایشیا کا پورا براعظم شامل تھا۔ اس وقت جاپان، کوریا، منچوریا منگولیا، چین، ویت نام، تھائی لینڈ، برما تبت، نیپال اور سری لنکا میں بدھ مت ایک زندہ مذہب ہے"[22]

گوتم بدھ کی پیدائش کے بارے میں عماد الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

" گوتم بدھ کی پیدائش کے بعد جن کا اصلی نام گوتم سدھارتھ رکھا گیا تھا، ان کے والد کے دربار میں ایک جوتشی پنڈت آیا اور اس نے بچہ کا زائچہ دیکھ کر یہ پیشین گوئی کی کہ بڑا ہو کر یہ بچہ یا تو ایک بہت مشہور سنیاسی، یا ایک بہت بڑا بادشاہ بنے گا۔ اس پیشین گوئی سے متاثر ہو کر گوتم بدھ کے والد، راجا سدودھن نے جو قدرتی طور پر گوتم بدھ کو ایک بہت بڑا بادشاہ دیکھنا چاہتے تھے، ایک بہت محفوظ محل میں بیٹے کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔[23] ان کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ دنیا میں رائج مختلف خیالات اور اثرات میں سے بعض سنیاس اور ترک دنیا کی طرف بھی رہنمائی کر سکتے تھے، جس کا کہ ان دنوں ہندوستان میں کافی چرچا ہوا چلا تھا۔ اس لئے ان سے محفوظ رکھ کر اگر محل کے ماحول میں گوتم بدھ کی پرورش کی جائے تو ان کے سنیاسی بننے کے خطرے کو ہمیشہ کے لئے ٹالا جا سکے گا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے راجا سدودھن نے الگ ایک محل بنوایا، جس میں سیر و تفریح اور دل بہلانے کے تمام مشغلے فراہم تھے۔ اس طرح اس محل میں کنیزوں، باندیوں اور خدمتگاروں کی ایک فوج کے درمیان شاہزادہ گوتم سدھارتھ کی پرورش شروع ہوئی"[24]

گوتم بدھ کی شخصیت اور تعلیمات نے مذہبی اور فکری تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان کی دعوت محض عقائد تک محدود نہیں بلکہ انسانی زندگی کی عملی اصلاح اور اخلاقی تربیت سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اسی پس منظر میں مختلف محققین نے بدھ مت کی تعلیمات کا تجزیہ کیا ہے، جن میں عماد الحسن فاروقی کا نام نمایاں ہے۔ وہ اپنی کتاب "دنیا کے بڑے مذاہب" میں گوتم بدھ کی مذہبی تعلیمات اور اخلاقی اصولوں کے متعلق رقمطراز ہیں:

"پانچ اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کا عہد بدھ مت کے ہر پیرو کو کرنا ہوتا ہے، وہ یہ ہیں:

1. کسی جاندار کو نہ مارنا
2. چوری نہ کرنا
3. جنسی بے راہ روی سے بچنا
4. جھوٹ نہ بولنا
5. اور نشہ آور چیزوں کا استعمال نہ کرنا"[25]

بدھ مت کے فکری نظام کی اساس چار عظیم سچائیوں پر رکھی گئی ہے۔ مصنف نے نہ صرف ان سچائیوں کا ذکر کیا ہے بلکہ ہر سچائی سے وابستہ عملی اور فکری مدارج کو بھی سلسلہ وار انداز میں واضح کیا ہے، جس سے بدھ مت کے اخلاقی اور روحانی تصورِ نجات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ باب میں بدھ مت کے اہم نظریات اور عملی پہلوؤں، جیسے مراقبہ، نروان اور روحانی ارتقاء کے مراحل پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مذہب کی تاریخی وسعت کو پیش کرتے ہوئے بدھ مت کی اشاعت و نشوونما، اس میں پیدا ہونے والے بھگتی کے رجحان، تری کایا کے عقیدے، بودھی ستوا کے تصور، نیز برکت اور کسبِ فیض کے نظریے کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ مزید برآں، مہایان بدھ مت کی فلسفیانہ ترقی اور اس کے فکری امتیازات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ باب کے اختتام کی طرف بدھ مت کے مختلف خطوں، بالخصوص وسط ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلاؤ اور اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ باب بدھ مت کے فکری، روحانی اور تاریخی پہلوؤں کا متوازن اور معلوماتی تعارف فراہم کرتا ہے۔

عماد الحسن فاروقی صاحب اپنی کتاب میں بدھ کی مذہبی تعلیمات کے متعلق رقمطراز ہیں:

> "گوتم بدھ کی تعلیمات کا مرکزی مقصد خواہشات کی قید سے آزادی، باطن کی صفائی، اور نروان کے حصول کی طرف رہنمائی ہے۔ گوتم نے بنیادی وجودی و فطری حقائق جیسے خدا، روح یا آخرت کے بارے میں تشریح کم کی، بلکہ زندگی کے عملی پہلو مثلاً والدین، استاد و شاگرد، شوہر و بیوی کے فرائض و حقوق، ہمدردی، شفقت، مساوات، حسن سلوک، ادب اور احترام جیسی اخلاقی اقدار بیان کیں۔ بدھ مت میں، ان تعلیمات کے تحت، انسان کا مقصد دُکھ کی جڑ یعنی خواہشات کو ختم کر کے نجات (نروان) پانا ہے"[26]

مذکورہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف بدھ مت کی تعلیمات ایک فلسفیانہ و اصلاحی تحریک کے طور پر دیکھتے ہیں جس میں دنیاوی زندگی کی عملی اصلاح اور اخلاقی تربیت پر تو بہت زیادہ زور دیا گیا ہے مگر بنیادی مذہبی اصول اور مابعد الطبیعیاتی تشریحات کو کم اہمیت دی گئی ہے۔

کتاب کے تیسرے باب میں جین مت کا جامع اور مربوط تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں سب سے پہلے جین مت کے پس منظر اور تعارفی مباحث کے ذریعے اس مذہب کی فکری اساس کو واضح کیا گیا ہے۔

جین مت کے تعارف کے متعلق عماد فاروقی رقمطراز ہیں:

> "جین عقیدہ کے مطابق جین مذہب ایک ابدی مذہب ہے جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ چونکہ ہندوستانی روایت میں دنیا کی کوئی ابتدا یا انتہا نہیں ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے جین مذہب بھی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ البتہ ہر دور میں مختلف وقفوں کے ساتھ، یکے بعد دیگرے چوبیس تیر تھنکر (مصلح) پیدا ہوتے ہیں جو اپنے اپنے زمانہ میں جین مت چوبیس کی اصلاح اور احیا کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ موجودہ اوسرپنی دورت کے پہلے تیر تھنکر سمجھا اور چوبیسویں یعنی آخری تیر تھنکر مہاویر جین تھے۔ اس دور میں مہاویر کے بعد اب اور کوئی کوئی تیر تھنکر نہیں آئے گا"[27]

اس کے بعد اس کے بنیادی عقائد پر گفتگو کی گئی ہے، خصوصاً روح اور غیر ذی روح کے تصور کو جین فلسفے کی روشنی میں بیان کیا گیا

ہے۔ مصنف نے جین مت کی اخلاقی تعلیمات کو خاص اہمیت دی ہے اور نجات کے تصور سے متعلق جین مذہب کے تین بنیادی اصولوں، یعنی سمیک درشن (صحیح عقیدہ)، سمیک گیان (صحیح علم) اور سمیک چرتر (صحیح عمل) کی وضاحت کی ہے، جو جین مذہبی زندگی کی اساس سمجھے جاتے ہیں۔ ہر مذہب چونکہ اپنے بنیادی عقائد و تعلیمات پر کھڑا ہوتا ہے، لہٰذا جین مت کے بھی ایسے مخصوص اور امتیازی عقائد ہیں جو اس کے فکری مزاج، اخلاقی نظام اور نجات کے تصور کو متعین کرتے ہیں، جیسا کہ عماد فاروقی رقمطراز ہیں:

> " یہ مذہب کسی خالق یا حاکم خدا کے تصور کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ کائنات کو ازلی و ابدی مانتا ہے۔ جین مت میں دو مستقل حقیقتیں تسلیم کی جاتی ہیں جیو (روح) اور اجیو (مادہ)۔ انسان کی اصل مشکل یہ ہے کہ اس کی روح کرم (اعمال) کے نتیجے میں مادّی آلودگی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ نجات (موکش) کا تصور کسی خدائی فضل سے وابستہ نہیں بلکہ مکمل طور پر انسان کی ذاتی کوشش، اخلاقی ضبط اور ریاضت پر موقوف ہے۔ فاروقی کے مطابق جین مت میں کرم کا قانون نہایت مرکزی حیثیت رکھتا ہے، جس کے تحت ہر عمل لازماً نتیجہ پیدا کرتا ہے، اور انہی کرموں سے نجات حاصل کرنا اصل مقصدِ حیات ہے۔ اس مقصد کے لیے جین مت پانچ عظیم اخلاقی اصولوں یعنی اہنسا (عدمِ تشدد)، سچ، عدمِ سرقہ، پاک دامنی اور ترکِ دنیا پر سختی سے عمل کو ضروری قرار دیتا ہے۔ فاروقی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جین مت ایک بلند اخلاقی اور ریاضتی نظام تو ہے، مگر چونکہ اس میں وحی، دعا اور خدا سے تعلق کا تصور موجود نہیں، اس لیے یہ ایک انفرادی نجاتی فلسفہ بن کر رہ جاتا ہے، نہ کہ مکمل اجتماعی مذہبی نظام ہے "[28]

اس کے بعد جین مت کے ارتقاء اور وقت کے ساتھ پیدا ہونے والی فرقہ بندی کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس سے اس مذہب کی داخلی ساخت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ باب میں جین مت کے مذہبی ادب کا تعارف بھی شامل ہے، جس میں اس کے اہم متون اور روایات کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخر میں ہندوستانی تمدن میں جین مت کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح جین مت نے اخلاق، فلسفہ، تہذیب اور معاشرتی اقدار کی تشکیل میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ مجموعی طور پر یہ باب جین مت کے فکری، اخلاقی اور تمدنی پہلوؤں کا متوازن اور معلوماتی تعارف فراہم کرتا ہے۔

کتاب کے چوتھے باب میں زرتشتی مذہب کا مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا گیا ہے، جس میں اس مذہب کی بنیادی تعلیمات کو زرتشتی روایت کے تاریخی ارتقاء کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف اس مذہب کی مقدس کتاب کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

> "زرتشت مذہب کی مقدس کتاب اوستا جو زرتشتیت کے جدید مطالعے کا سب سے بڑا ماخذ ہے، زمانے کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکی اور کہا جاتا ہے کہ آج اس کا صرف چوتھائی حصہ موجود ہے۔"[29]

مزید ان کی عجیب و غریب صورت حال کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "زرتشتی مذہب کی عجیب و غریب صورت حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اوستا کا جو قلیل حصہ زرتشت پیغمبر کا اپنا کلام کہا جاسکتا ہے اور جو گاتھا کے نام سے موسوم ہے وہ خود اوستا کے بعد کے حصوں کے مصنفین کی سمجھ سے بالاتر تھا اور وہ اس قدیم زبان کے علم سے جس میں کہ ان کے پیغمبر نے خطاب کیا تھا، بالکل ناواقف نظر آتے ہیں"[30]

مصنف نے اس باب میں زرتشت کی دعوت، اخلاقی اصولوں اور فکری بنیادوں کو واضح کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح زرتشتی مذہب کی تعلیمات وقت کے ساتھ مختلف ادوار سے گزرتی ہوئی ایک منظم مذہبی روایت کی صورت اختیار کرتی ہیں۔

ان کے مطابق زرتشت کی مذہبی تعلیمات ایک مضبوط اخلاقی اور توحیدی بنیاد پر قائم ہیں جن کا مرکزی تصور اہورامزدا کی وحدانیت ہے، جو خیر، عقل اور سچائی کا سرچشمہ ہے۔ زرتشت مذہب میں کائنات کو خیر و شر کی مسلسل کشمکش کا میدان قرار دیا گیا ہے، جہاں خیر کی نمائندگی اہورامزدا جبکہ شر کی علامت اہرمن ہے، تاہم انسان کو مکمل اخلاقی اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آزاد ارادے سے نیکی یا بدی کا انتخاب کرے زرتشت مذہب میں آخرت، جزا و سزا اور حساب کا تصور بھی واضح ہے، جس کے تحت انسان اپنے اعمال کے نتائج کا خود ذمہ دار ہے۔ فاروقی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زرتشت کے مخصوص طریقہ عبادت اور مذہبی رسومات کے متعلق ہمارے پاس واضح معلومات نہیں ہیں، جیسا کہ وہ رقمطراز ہیں:

> "زرتشت کی تعلیمات کے اس مختصر جائزے کے بعد زرتشتیوں کے مخصوص طریق عبادت اور مذہبی رسومات کے متعلق صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے پاس واضح معلومات نہیں ہیں سوائے اس کے کہ زرتشت کے نزدیک آگ ایک مخصوص مذہبی اہمیت کی حامل تھی۔ اپنی نورانی صفت کے پیش نظر آگ اس دنیا میں اہورامزد کا نشان اور نمائندہ سمجھی گئی"[31]

مجموعی طور پر یہ باب زرتشتی مذہب کے فکری اور اخلاقی پہلوؤں کو تاریخی تناظر میں سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

کتاب کا پانچواں باب سکھ مت کے تعارف پر مشتمل ہے اس میں مصنف نے سکھ مذہب کی بنیادی تعلیمات کو واضح کرتے ہوئے سکھ روایت کے ارتقائی مراحل کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس باب میں سکھ مت کے فکری اور اخلاقی اصولوں کو تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح یہ تعلیمات وقت کے ساتھ ایک منظم مذہبی روایت کی صورت اختیار کرتی گئیں۔

بانیانِ مذاہب کی سیرت نگاری میں یہ ایک معروف اور مشترک اسلوب ہے کہ تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ مذہبی روایت اور اعتقادی عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں، جن کا مقصد بانی مذہب کی غیر معمولی عظمت اور امتیازی حیثیت کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں جب گرونانک صاحب کی حیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان کی زندگی کے ابتدائی حالات، خاندانی پس منظر اور سماجی ماحول کے بیان کے ساتھ ایسی روایات بھی سامنے آتی ہیں جن میں خرقِ عادت واقعات اور کرامات کا ذکر ملتا ہے۔

جیسا کہ مصنف اس کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> "مذہبی روایت کا دستور ہے کہ اپنے ماننے والوں کے نزدیک بانیان مذاہب کی زندگی اپنی ابتدا سے ہی ایسے خرق عادات واقعات اور کرامات کے ساتھ منسوب ہو جاتی ہے۔ جس کا مقصد بانی مذہب کی غیر معمولی شخصیت پر زور دینا ہوتا ہے[32]، گرونانک صاحب کی روایتی سیرت میں بھی ایسے عناصر کا معتد بہ حصہ موجود ہے سکھ روایت میں گرونانک صاحب کی پیدائش کے وقت سے لے کر بچپن، لڑکپن، جوانی اور بعد میں ان کے بحیثیت روحانی رہنما کے سبھی ادوار میں ایسے قصے اور واقعات موجود ہیں جو ان کے براہ راست غیبی امداد سے مستفیض اور انسانوں میں ان کے غیر معمولی مقام پر فائز ہونے پر دلالت کرتے ہیں"[33]

باباگرونانک نے ایک طویل روحانی جستجو کے بعد توحید، انسانی مساوات اور خدمتِ خلق پر مبنی تعلیمات پیش کیں۔ آپ نے ذات پات، مذہبی تعصب اور رسوم پرستی کی مخالفت کی اور اپنے اس پیغام کی تبلیغ کے لیے وسیع تبلیغی اسفار کیے اور اپنے کلام کے ذریعے ایک ایسے مذہبی و اخلاقی نظام کی بنیاد رکھی جسے بعد ازاں سکھ مت کی صورت میں باقاعدہ شناخت حاصل ہوئی۔ عماد الحسن فاروقی سکھ مت کی تعلیمات کے متعلق رقمطراز ہیں:

"گرونانک کی مذہبی تعلیمات زیادہ تر شعری اور منظوم اسلوب میں محفوظ ہیں، جو بعد میں گرو گرنتھ صاحب کا حصہ بنیں۔ گرونانک نے اپنے پیغام کو فلسفیانہ نثر کے بجائے ایسے اشعار کے ذریعے پیش کیا جو عام انسان کی سمجھ کے قریب ہوں اور دل پر اثر کریں۔ ان کا عقیدہ توحید اسلامی نظریہ توحید سے مختلف نہیں تھا۔"[34]

"ایک اونکار ست نام کرتا پرکھ نِربھَو نِروَیر

یعنی خدا ایک ہے اس کا نام سچ ہے وہی فاعلِ مطلق وہ بے خوف ہے اس کی کسی سے دشمنی نہیں ہے۔"[35]

ان اشعار میں توحید، خدا کی حمد، انسان کی عاجزی، دنیا کی ناپائیداری، ذات پات اور ظاہری مذہبی رسوم کی نفی، اور اخلاقی کردار کی اصلاح جیسے مضامین بار بار سامنے آتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ باب سکھ مت کی دینی فکر، عملی اقدار اور تاریخی تشکیل کا سادہ مگر بامعنی تعارف فراہم کرتا ہے۔

کتاب کا چھٹا باب یہودیت کے حوالے سے ہے جس میں مصنف نے اس مذہب کا تاریخی اور مذہبی تعارف نہایت جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ باب میں یہودیت کی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے بیان کیا گیا ہے، خصوصاً عہدِ مہاجرت کے دوران یہودی قوم کو درپیش مذہبی اور سماجی چیلنجز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض ادوار میں پیش آنے والے مذہبی ارتداد اور فکری انحرافات کا ذکر بھی کیا گیا ہے، جس سے یہودیت کے داخلی نشیب و فراز واضح ہوتے ہیں۔ اسلام کے ساتھ اس کے تعلق کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہودیت کی مذہبی روایت کا سلسلہ تقریباً پونے چار ہزار سال قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بزرگ شخصیت سے جا کر ملتا ہے۔ مذاہب میں قدامت کے لحاظ سے اولیت یہودیت کو ہی حاصل ہے اور بلاشبہ بعد میں آنے والے مذاہب عیسائیت اور اسلام نے یہودیت سے اپنے خاندانی تعلق کا پورا اظہار کیا ہے"[36]

مزید برآں، دورِ جدید میں یہودی فکر اور معاشرتی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں اور یہودی نشاۃِ ثانیہ کے رجحانات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ باب میں یہودیت کے اہم مذہبی تہواروں، جیسے "سبت (سباتھ)، پشاخ، شووس، یومِ کپور، سکوت، پیورم، ہنوخاّ اور تیشاباو" وغیرہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے، جن سے یہودی مذہبی زندگی کی عملی صورت سامنے آتی ہے جس طرح ہر مذہب اپنے عقائد و تعلیمات کی تجدید اور روحانی شعور کو زندہ رکھنے کے لیے مخصوص تہوار مناتا ہے، اسی طرح یہودیت میں بھی کئی اہم تہوار منائے جاتے ہیں جو مذہبی، تاریخی اور اخلاقی پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں، جیسا کہ عماد الحسن فاروقی رقمطراز ہیں:

"یہودی مذہب میں مذہب میں ہفتہ وار عبادت اور آرام کا دن سَبّت[37]، مصر سے نجات کی یاد میں منایا جانے والا پَسُواخ، خوشی اور روشنی کے تہوار ہَنُوخاّ، توبہ اور مغفرت کا دن یوم کپور، اور عارضی کُوٹوں کا تہوار سُکوت شامل ہیں۔ اس کے علاوہ قوم کی تاریخی مصائب کی یاد میں تیشا باؤ اور خوشی و فلاح و بہبود کی یاد میں پیوریم منایا جاتا ہے"[38]

عماد الحسن فاروقی کے مطابق یہ تہوار نہ صرف عبادت اور روحانی تجدید کے مواقع ہیں بلکہ یہودیت کے اجتماعی شعور، اخلاقی تعلیمات اور تورات کی ہدایات کو زندہ رکھنے کا عملی ذریعہ بھی ہیں، جس کے ذریعے ہر نسل اپنے مذہبی اور تاریخی ورثے سے جڑی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ یہودیت کی مقدس کتابوں اور مذہبی مصادر کا ذکر بھی شامل ہے۔ مجموعی طور پر یہ باب یہودیت کے تاریخی، مذہبی اور تہذیبی پہلوؤں کا مربوط اور معلوماتی جائزہ فراہم کرتا ہے۔ یہودی مذہب کی مقدس کتب کے حوالے سے عماد حسن فاروقی رقمطراز ہیں:

"یہودی کسی ایک مقدس کتاب کو نہیں مانتے بلکہ یہ کئی صحیفے ہیں جو مختلف زمانوں میں مختلف شخصیتوں کے ذریعے مرتب کئے گئے اور اجتماع امت سے مستند قرار پائے۔ یہودیوں کی مقدس کتب یا عہد نامہ قدیم کی پہلی پانچ کتابیں توریت کہلاتی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مرتب کردہ سمجھی جاتی ہیں۔ انہیں میں وہ حصہ بھی شامل ہے جو احکام عشرہ پر مشتمل ہے جو یہودیوں کے نزدیک خدا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی الواح کی صورت میں حضرت موسی علیہ السلام کو کوہ طور پر دیا گیا تھا"[39]

کتاب کا ساتواں باب عیسائیت سے متعلق ہے جس میں مصنف نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور تعلیمات کو بنیادی حیثیت دیتے ہوئے عیسائی فکر کی تشکیل کو واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو جاننے کا ہمارے پاس براہ راست کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ان کے جو بھی حالات اور تعلیمات ہم تک پہنچی ہیں وہ اُن کے حواریوں، بلکہ حواریوں کے بھی شاگردوں کے، بیانات پر مبنی ہیں، اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ عیسائیت کی تشکیل میں حضرت عیسیٰؑ کی اپنی تعلیمات کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ عیسائی مذہب کی بنیاد، در حقیقت، اُن تصورات اور عقائد پر ہے جنہیں حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں اور ابتدائی شاگردوں نے حضرت عیسیٰؑ کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اُن سے متعلق اپنانا شروع کر دیا تھا"[40]

ایک اور مقام پر صاحب کتاب رقمطراز ہیں:

"حضرت عیسیٰؑ کی حیات اور تعلیمات کے لئے ہم اگر عہد نامہ جدید سے باہر کوئی ماخذ تلاش کرنا چاہیں تو ہم کو قطعاً مایوس ہونا پڑتا ہے۔ اس عہد کی غیر عیسائی تحریروں اور مؤرخین کے لئے شاید ابھی عیسائیت کے بانی یا خود عیسائی تحریک کی ایسی اہمیت نہیں تھی کہ اس کا کسی قدر تذکرہ وہ اپنی تاریخوں میں کر سکیں۔ یہودی تلمود میں چند مختصر حوالوں اور یہودی مورخ یوسفس فلاویس کے سرسری ذکر کے علاوہ رومی مورخین نے سی ٹس اور پلنی خورد کی تحریروں میں عیسائیت کا محض برائے نام ذکر آتا ہے۔ جس سے صرف یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نام کی ایک شخصیت کا وجود تھا اور اُن کے کچھ معتقدین بھی تھے"[41]

اس باب میں حضرت عیسیٰؑ کی دعوت، اخلاقی تعلیمات اور ان کے اثرات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جنہوں نے عیسائیت کے فکری اور مذہبی ڈھانچے کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد عیسائی عقائد کی توضیح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح وقت کے ساتھ یہ عقائد باقاعدہ مذہبی نظریات کی صورت اختیار کرتے گئے۔

مزید برآں، باب میں روحِ عیسائی (Holy Spirit) کے تصور اور اس کی عقیدتی حیثیت کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے، نیز عیسائی چرچ کی تشکیل اور ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں چرچ کے ادارہ جاتی ڈھانچے، فکری اختلافات اور تاریخی مراحل کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ باب عیسائیت کے فکری، عقیدتی اور ادارہ جاتی پہلوؤں کا جامع اور مربوط تعارف فراہم کرتا ہے۔

عیسائیت کے عقائد اور تعلیمات کا مرکز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات اور ان کے پیغام کو حاصل ہے، جنہیں عیسائی خدا کا بیٹا اور انسانیت کا نجات دہندہ مانتے ہیں۔ اس مذہب میں تثلیث کا عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے، جس کے مطابق خدا باپ، بیٹا اور روح القدس تین اقانیم میں ایک ہی ذات ہے۔ عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کے متعلق عماد الحسن فاروقی رقمطراز ہیں:

> "اس عقیدے کے مطابق خدا کی ایک حقیقت تین شکلوں میں موجود ہے، ایک خدا باپ، جو تخلیق و ربوبیت کا سرچشمہ ہے، دوسرے خدا بیٹا جو حضرت عیسیٰؑ کی شکل میں اس دنیا میں مجسم ہوا اور عالم کی نجات کا باعث بنا، اور تیسرے روح القدس جو مومنوں اور عیسائی امت میں بحیثیت مجموعی سرایت کئے ہوئے ایمان و یقین اور رہنمائی کا باعث بنتا ہے۔[42] عیسائیت کے متکلمین اور دینیات کے عالموں نے صدیوں اپنی بہترین دماغی صلاحیتیں اس کوشش میں کھپادیں کہ ایک طرف تو وہ تثلیث کو اس تصور سے محفوظ رکھ سکیں کہ یہ تین الگ الگ خداؤں کو ماننا ہے، کیونکہ یہ صریحی شرک ہوتا ہے اور عیسائیت کا ہمیشہ یہ اصرار رہا ہے کہ وہ توحید پرستار اور شرک سے اتنا ہی بے زار ہے جتنا کوئی بھی توحیدی مذہب ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف ایک الوہی حقیقت میں تین مخصوص صورتوں (خدا، بیٹا اور روح القدس) کا اقرار اور تینوں کی مخصوص انفرادی حیثیت کی پہچان بھی عیسائی علما کے نزدیک عیسائیت کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی تھی"[43]

کتاب کا آخری باب اسلام کے متعلق ہے جس میں مصنف نے اسلام کے بنیادی عقائد اور اساسی تعلیمات کو مرکز بنا کر اس مذہب کا جامع تعارف پیش کیا ہے۔ اور اس کا تعلق سابقہ الہامی مذاہب سے جوڑا ہے، جیسا کہ عماد الحسن فاروقی رقمطراز ہیں:

> "اپنے بنیادی تصورات کے لحاظ سے، مذاہب عالم کے طالب علم کے لئے، اسلام، سامی مذاہب کی اس روایت سے تعلق رکھتا ہے جس میں تاریخی عوامل کے تحت ایرانی عناصر بھی شامل ہو کر اُس کا جزو لاینفک بن چکے تھے، جہاں تک اسلام کے سامی روایت سے متعلق ہونے کا تصور ہے، خود قرآن پاک میں اس بات پر انتہائی زور دیا گیا ہے، اور اسلام کو دینِ ابراہیمی اور پیغمبران بنی اسرائیل کی لائی ہوئی ہدایت کے مطابق بتایا گیا ہے"[44]

اور ساتھ ہی یہودی مذہب سے اس کے امتیاز کو بیان کرتے ہوئے اسلامی تصور اِلٰہ کے حوالے سے صاحب کتاب رقمطراز ہیں:

> "اسلامی تصور اِلٰہ یہودی تصور سے، باوجود بہت کچھ مشترک رکھنے کے، اس لحاظ سے بھی مختلف ہے کہ یہودیت میں خدا تعالیٰ کی رحمت و ہدایت، توجہ و تعلق نیز اس کی انسانوں کے کام آنے والی تمام خصوصیات، بنی اسرائیل کے لئے مخصوص

ہیں، جو کہ ایک نسلی بنیاد پر قائم جماعت تھی۔ یہودی روایت میں خدا تعالیٰ کا عہد من حیث الجماعت بنی اسرائیل سے تھا۔ جس میں دوسرے بنی نوع انسان نہیں شریک تھے۔ اسلامی تصور الہ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و ہدیات اور فائدہ پہنچانے والی صفات تمام انسانوں (اور بہت سی خصوصیات تمام مخلوقات) کے لئے عام ہیں"[45]

اسلام میں عبادات کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان تعلق کو مضبوط کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اسلامی عبادات محض رسمی اعمال نہیں بلکہ ایمان، اطاعت اور تزکیۂ نفس کا عملی اظہار ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسی عبادات انسان میں بندگی، نظم و ضبط، صبر، ایثار اور تقویٰ کی صفات پیدا کرتی ہیں اور اسے اللہ کی یاد میں ہمہ وقت بیدار رکھتی ہیں۔ اسلام میں عبادت کا دائرہ صرف مخصوص اعمال تک محدود نہیں بلکہ نیک نیت کے ساتھ کیا جانے والا ہر جائز عمل بھی عبادت شمار ہوتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام انسان کی پوری زندگی کو اللہ کی رضا کے تابع کرنا چاہتا ہے۔، جیسا کہ عماد الحسن فاروقی رقمطراز ہیں:

"اسلام میں عبادات کا مقصد خدا کے حضور میں انسان کا اپنی عبدیت اور بندگی کا اعتراف داظہار کرنا ہے اور اسی مناسبت سے ان عبادات کو حقوق اللہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔[46] اپنی مرکزی اہمیت اور ظاہری عمل سے تعلق رکھنے کی بناپر یہ عبادات مسلمانوں کے مخصوص شعار کی حیثیت بھی رکھتی ہیں اور جزوی اختلاف کے ساتھ ہر فرقہ اور مسلک کے مسلمانوں میں مشترک ہیں۔ اپنی اس نوعیت میں یہ عبادات مسلمانوں کے درمیان باہمی رشتہ اخوت کو مضبوط کرنے اور امت مسلمہ کو دوسری قوموں سے ممتاز کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں"[47]

اس کے بعد باب میں توحید، رسالت اور آخرت جیسے بنیادی عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور عملی تعلیمات کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ مزید برآں، اس باب میں اسلامی روایت اور اسلامی تمدن کے ارتقاء کو تاریخی تناظر میں بیان کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح اسلامی تعلیمات نے مختلف ادوار میں تہذیب، معاشرت، علم اور ثقافت کی تشکیل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مجموعی طور پر یہ باب اسلام کے فکری، دینی اور تمدنی پہلوؤں کا مربوط اور متوازن تعارف فراہم کرتا ہے۔

المختصر عماد الحسن فاروقی کی کتاب "دنیا کے بڑے مذاہب" تقابلی مطالعہ ادیان کے سلسلے میں ایک معتبر اور منظم علمی کاوش ہے، جس میں مصنف نے انسانی تاریخ میں ظہور پذیر ہونے والے بڑے مذاہب کو ان کے اصل مصادر، بنیادی عقائد، اخلاقی تعلیمات اور تہذیبی اثرات کے تناظر میں نہایت سادہ، مؤثر اور تحقیقی انداز سے پیش کیا ہے۔ کتاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی مذہب پر تنقیدی یا جذباتی رائے قائم کرنے کے بجائے، ہر مذہب کو اس کے اپنے زاویہ نظر اور اس کے اپنے اصولوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، جو اسے ایک غیر جانب دار، علمی اور تحقیقی تصنیف بناتی ہے۔ مصنف نے مذہبی تاریخ، سماجی تناظر اور فکری ارتقاء کو اس خوبصورتی سے یکجا کیا ہے کہ قاری کو نہ صرف ہر مذہب کی بنیاد سمجھ میں آتی ہے بلکہ اس کے تاریخی تسلسل کا ایک واضح نقشہ بھی سامنے آتا ہے۔

نتائج بحث

- مذاہبِ عالم کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ہر مذہب نے اپنے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں انسانی زندگی کی اخلاقی اور فکری رہنمائی کی ہے۔

- ہندو مت ایک قدیم اور ارتقائی مذہبی روایت ہے جس میں ویدی، اپنیشدی اور فلسفیانہ عناصر مل کر ایک متنوع مگر غیر منظم مذہبی نظام تشکیل دیتے ہیں۔
- بدھ مت اور جین مت غیر ویدک اصلاحی تحریکوں کے طور پر سامنے آئے، جنہوں نے رسم پرستی کے مقابلے میں اخلاقی تطہیر، ضبطِ نفس اور نجاتِ فرد پر زور دیا۔
- زرتشت مذہب نے خیر و شر کی اخلاقی کشمکش اور انسانی ذمہ داری کے تصور کو مضبوط بنیادوں پر پیش کیا، جو قدیم مذاہب میں ایک نمایاں اخلاقی نظام کی مثال ہے۔
- سکھ مت نے برصغیر میں توحید، انسانی مساوات اور خدمتِ خلق پر مبنی ایک اصلاحی مذہبی روایت قائم کی، جس میں شاعرانہ تعلیمات اور اجتماعی عبادت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔
- یہودیت ایک قدیم توحیدی مذہب ہے جو شریعت، تاریخی عہد اور اجتماعی مذہبی شناخت کے تصور پر قائم ہے۔
- عیسائیت نے محبت، قربانی اور نجات کے تصورات کو مرکزی حیثیت دی، تاہم اس کی عقائد کی تشکیل میں تاریخی اور کلیسائی ارتقا کا کردار نمایاں رہا۔
- ان تمام مذاہب کے تقابلی مطالعے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اسلام ایک جامع، آفاقی اور متوازن نظامِ حیات ہے جو توحیدِ خالص، عالمگیر رسالت، منظم عبادات اور اخلاقی و سماجی نظام کو یکجا کرتا ہے۔
- اسلام نہ صرف سابقہ الہامی مذاہب کی تصدیق کرتا ہے بلکہ ان کی تعلیمات کو عالمگیر انسانی سطح پر وسعت دے کر مکمل ہدایت فراہم کرتا ہے۔

سفارشات

- مذاہبِ عالم کے مطالعے کو محض تعارفی سطح تک محدود رکھنے کے بجائے تقابلی اور تنقیدی انداز میں فروغ دیا جائے تاکہ ہر مذہب کی فکری و اخلاقی جہات بہتر طور پر سامنے آسکیں۔
- اسلامی تعلیمات کو دیگر مذاہب کے تناظر میں پیش کرتے وقت قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ مستند تحقیقی مصادر، بالخصوص عماد الحسن فاروقی جیسے محققین کی آراء سے استفادہ کیا جائے۔
- تعلیمی اداروں میں مذاہبِ عالم کے نصاب کو اس انداز میں مرتب کیا جائے کہ طلبہ میں مذہبی رواداری، فکری وسعت اور باہمی احترام کا جذبہ پیدا ہو۔
- بین المذاہب مکالمے کو علمی بنیادوں پر فروغ دیا جائے تاکہ تعصب کے بجائے فہم، امن اور باہمی تعاون کی فضا قائم ہو۔

مصادر و مراجع

[1]۔ اقتدار محمد خان، تعزیتی نشست، شعبہ اسلامک سٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، 15 مارچ 2023۔

[2]-https://urdu.hindusthansamachar.in/Encyc/2025/1/13/Prof-Iqtedar-M-Khan-Azad-Farooqi.php, accessed on 23 feb,2026.at 9:27.

[3]-https://www.rekhta.org/authors/imadul-hasan-azad-farooqi/ebooks?lang=ur access on 23 feb,26 at 9:30.

[4]-https://urdu.hindusthansamachar.in/Encyc/2025/1/13/Prof-Iqtedar-M-Khan-Azad-Farooqi.php, accessed on 23 feb,2026.at 9:27.

[5]-Ibid

[6]- Ibid

[7]عماد الحسن آزاد فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب** (لاہور: آر۔ آر۔ پرنٹرز، 2018ء)، 12

[8]آزاد فاروقی، **"دنیا کے بڑے مذاہب**، 23۔

[9]آزاد فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب**، 23۔

[10] فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب**، 25۔

[11] . A. L. Basham, *The Wonder That Was India*, London: Sidgwick & Jackson, 1954), 289.

[12] . Basham, *The Wonder That Was India*, 24

[13]فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب**، 26۔

[14] S. Radhakrishnan, *Indian Philosophy*, vol. 1 (London: George Allen & Unwin, 1923), 21.

[15]فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب**، 27۔

[16] -Jan Gonda, *Vedic Literature (Saṁhitās and Brāhmaṇas)* (Wiesbaden: Otto Harrassowitz, 1975), 5–6.

[17] - A. L. Basham, *The Origins and Development of Classical Hinduism* (Oxford: Oxford University Press, 1989), 4.

[18]فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب**، 27۔

[19]**رگ وید**، دسواں باب، بھجن نمبر 90، ص 38۔

Stephanie W. Jamison and Joel P. Brereton, trans., *The Rigveda: The Earliest Religious Poetry of India*, vol. 3 (New York: Oxford University Press, 2014), 1424 (Rigveda 10.90.12).

[20]پنداری ناتھ پربھو، (بمبئی: ہندو سوچل آرگنائزیشن، 1954)، 294۔

[21] فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب**، 52۔70۔

[22] فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب**، 81۔

[23] - T. W. Rhys Davids and Hermann Oldenberg, *Buddha: His Life and Teaching* (New York: Dover Publications, 1961), 12.

[24] فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب**، 83۔

[25]دی بدھازا، **انیشینٹ پاتھ** (لندن 1964 پیادسی تھیرا، 1964)، 57۔؛ فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب**، 103۔

[26] فاروقی، **دنیا کے بڑے مذاہب**، 106۔119۔

[27] ہرمین جیکوبی، **ایجز آف دی ورلڈ (انڈین)**، شمولہ جیمس ہیسٹنگس "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" ایڈنبرگ، 1/2002؛ فاروقی، **دنیا کے بڑے**

مذاہب،136۔

[28] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،143۔151

[29] انسائکلوپیڈیا آف برٹینیکا، مضمون زورآسٹر نیزم اینڈ پارسی ازم (شکاگو:1975)،1173

[30] آر سی زیہنر، ڈان اینڈ ٹوی لائٹ آف زوراسٹر نیزم (لندن:1961)26-27۔؛فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،166۔

[31] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،183۔

Mary Boyce, *Zoroastrians: Their Religious Beliefs and Practices* (London: Routledge & Kegan Paul, 1979), 25.

[32] - W. J. Johnson, *Miracles and Religious Founders: Comparative Perspectives* (London: Routledge, 2002), 45.

[33] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،210۔

Puran Singh, trans., *Janamsakhis of Guru Nanak* (New Delhi: Oxford University Press, 1979), 12–14.

[34] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،216۔

[35] گرو گرنتھ صاحب 1۔

G. S. Mann, *Introduction to Sikhism* (New Delhi: Manohar Publishers, 2001), 22.

[36] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،237۔

[37] -Michael L. Satlow, *Jewish Liturgy: A Comprehensive History* (New York: Jewish Publication Society, 2000), 88.

[38] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،269۔274۔

[39] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،275۔

[40] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،279۔

[41] جیمس۔ سی۔ جی گریگ، دی نیو ٹسٹامنٹ اینڈ کرسچن اوریجنز، ص1187۔؛فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،285۔

[42] - Alister E. McGrath, *Christian Theology: An Introduction* (Oxford: Blackwell, 2001), 201.

[43] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،312۔

[44] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،327۔

[45] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،329۔

[46] سید سابق، فقہ السنۃ، ترجمہ: مفتی محمد تقی عثمانی (کراچی: دار الکتاب، 1994)،1:15۔

[47] فاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب،344؛یوسف القرضاوی، فقہ العبادات (دوحہ: دار التقوی، 1998)،22۔